⊙ محمد رؤف

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

⊙⊙ ڈاکٹر رابعہ سرفراز

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

حامد سراج کے افسانوں میں عالمگیریت

Abstract:

Muhammad Hamid Saraj is a radiant star among the galaxy of the short story writers of the eighties. Despite hailing from the far flung district of Mianwali, his literary status is nothing shorter than any other high-ranked writer belonging to the centers of mainstream art and literature. He deals with the themes of modern world and its impacts on Pakistani society. His short stories reflect the problems and decline of moral values in the wake of globalization. He pays homage to his glorious legacy. He mourns lack of leisure, indifference, and deviousness of modern man. He gets disappointed seeing his fellow beings working like machines and declining fraternity among them. Atrocities committed by American forces as well as terrorism of the extremists are the themes of his writings. This study deals with the impacts of globalization that promotes western civilization and depreciates eastern traditions.

Keywords:

Hamid Saraj, Novel, Globalization, Fiction, Short Story

محمد حامد سراج نسل نو کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے میانوالی جیسے دوردراز علاقے میں رہ کر بڑی چابکدستی اورفنی مہارت سے ادبی دنیا میں ایسی پہچان بنائی ہے جس پر ادبی مراکز کے اہم افسانہ نویس بھی رشک کریں۔نئی صدی میں منظر عام پر آنے والے ان کے افسانوی مجموعے اردو کہانی کو اعتبار اور زبان کو وقار عطا کر رہے ہیں۔ان کی

تحریریں تصنع سے مطلق پاک ہیں اور مکالمے ملمع سازی سے بے نیاز۔ وہ رواں کہانی بیان کرنے کے عادی ہیں، زبردستی نتائج اخذ کرنے اور انہیں قاری پر تھوپنے کے قائل نہیں۔ وہ کہانی لکھتے ہیں بناتے نہیں۔ ان کی کہانیوں کے مرکزی یا اہم کردار ہمارے ماحول کے عکاس ہوتے ہیں، وہ بلاوجہ دانشوری بگھارنے یا ملکوں ملکوں سیر و سیاحت کے نام پر قاری کو الجھانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ پروفیسر وارث علوی کے بقول:

''محض کہانی کہنا آرٹ نہیں ہے، واقعہ یا ماجرا کا بیان افسانہ نگاری میں ہے۔ بلکہ واقعہ، کردار اور واردات کو معنی خیز طور پر بیان کرنا اور کسی ایسے تھیم کو ابھارنا جو بصیرت افروز ہو کہانی کار کو فنکار بناتا ہے۔'' (۱)

پروفیسر مظہر حسین کی رائے میں:

''حامد کی کہانی کی لے وہی ہے مگر تان میں تنوع اور اس پر تھرکتی کہانی کی چال الگ......موت کی گرم سانسوں کے درمیان زندگی اپنے ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔ ان تمام معروضی کڑوے کسیلے حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جو اس کے ہونے کو چیلنج کرتے ہیں اور اسے امر بھی کر دیتے ہیں۔ زندگی کی دوڑ میں جو اپنے ہونے کے سارے پتے ہوشیاری سے کھیلتا ہے، امر ہو جاتا ہے۔ محمد حامد سراج کی کہانی کا یہی نیا پن اسے زندگی عطا کرتا ہے، ایک ایسی کہانی جو زمین کی مہک سنگھ کر زندہ رہ سکے۔'' (۲)

ان کی کہانیوں کے اکثر کردار اپنی زمین اور روایت سے جنم لیتے ہیں لیکن سائنس و ٹیکنالوجی سے جنم لیتی نئی دنیا اور اس سے جنم لیتے مسائل بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں۔ تشبیہات و استعارات اور روزمرہ و محاورات کا برمحل استعمال ان کے افسانوں کو گہرائی اور وسعت عطا کرتا ہے۔ وہ کرداروں کی مناسبت سے مقامی و عالمی زبانوں کا برتاؤ اس نفاست سے کرتے ہیں کہ کوئی مکالمہ بوجھل محسوس نہیں ہوتا۔ منظر نگاری پر بھی بھرپور توجہ دی گئی ہے، تاثرات کو الفاظ و بیان کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر خداداد ہے۔ حامد کی کہانی کوئی جھرنا ہے نہ آبشار بلکہ سکون سے بہتی ایک ندی ہے جو شور مچائے بغیر منزل کی جانب محوِ سفر رہتی ہے۔ آسانی اور روانی اس کی خصوصیات ہیں، کہیں کہیں اچانک موڑ بھی آ جاتا ہے، کبھی جھال پر پانی میں تھوڑی تندی بھی پیدا ہو جاتی ہے، کبھی سرکنڈے بھی گھیر لیتے ہیں لیکن عام طور پر یہ ندی سکون سے میدانوں میں اپنا سفر جاری رکھتی اور کھیتوں کو سیراب کرتی، فصلوں کو لہلہاتی اور کسانوں کے دل کو گدگداتی جاتی ہے۔ چونکا دینے والی سنسنی خیزی پیدا کرنے سے حامد اجتناب کرتے ہیں۔ وہ ایک فطری کہانی کار ہیں جسے اپنی بات کہنے کیلئے کسی مصنوعی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سائرہ غلام نبی کہتی ہیں:

''محمد حامد سراج نہ کسی منصوبہ بندی کے تحت کہانی سوچتا ہے نہ کہانی کے تار و پود بننے کیلئے کیل کانٹوں سے لیس ہوتا ہے، نہ ہی کہانی کہنے کیلئے دانشوری کا چولا پہنتا ہے، اور نہ ہی اپنی کہانی کو کسی دائرے کا قیدی بناتا ہے۔ پر کہانی کو اس کہانی کار سے کچھ خاص تعلق ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اس کی تلاش میں رہتی ہے۔'' (۳)

حامد سراج حساس دل رکھتے ہیں اور دنیا میں کہیں بھی ہونے والے ظلم و ناانصافی پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ان کے افسانوں میں محبت اور نفرت، خوشی اور غم، کرب اور بے چارگی ہر طرح کے موضوعات موجود ہیں تاہم انہوں نے دہشت گردی، انسانی بے حسی اور دم توڑتی انسانیت کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔وہ آزردہ ہیں کہ مغرب کی ہوس پرستی اور ظالمانہ پیش قدمی نے ہمیں ہر محاذ پر پسپا کر ڈالا ہے۔ہمارے دلوں میں موجود انسانی ہمدردی لب گور جا پہنچی ہے، ہماری تہذیب و ثقافت زیرِ عتاب ہے اور ہمارے رسوم و رواج زیرِ یلغار۔دولت اور شان و شوکت کی طلب ہمیں خود سے بھی بیگانہ بنائے جاتی ہے، کرپشن، رشوت اور فحاشی کا کلچر ہمارے رگ و پے میں اس قدر سرایت کر چکا ہے کہ اب لوگوں کی اکثریت اس کو برائی یا خرابی بھی تسلیم نہیں کرتی۔پروفیسر وارث علوی کہتے ہیں:

''کم از کم ادب میں تو موضوع کو سماجی زندگی سے بالکل بے نیاز نہیں رکھا جا سکتا۔''(۴)

مصنف کے اکثر افسانے بھی معاشرے کا وہ کرب ہیں جو اسے نئی صدی اور نئی صورتحال نے عطا کیا۔یہ افسانے اسی انسانی المیے کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی شناخت ہونے کے باوجود ہم اس سے کنارا کشی کو تیار نہیں۔ان کے افسانوں کی تین کتابیں برائے فروخت ،چوب دار اور وقت کی فصیل ۲۰۰۹ء جبکہ چوتھا افسانوی مجموعہ بخیہ گری ۲۰۱۳ء میں منصۂ شہود پر آیا۔یہ وہ دور ہے جب عالمی طاقتوں خاص طور پر امریکہ کی وحشت عروج پر رہی اور اس نے دنیا میں امن قائم کرنے کے نام پر نیٹو کے ذریعے افغانستان میں ظالمانہ دراندازی کی، عراق کو دہشت گردی کی نام نہاد جنگ کی بھینٹ چڑھا دیا، شام میں بھی کٹھ پتلی لانے کیلئے جنگ کا جواز پیدا کیا۔القاعدہ کو ختم کرنے کی مہم میں لاکھوں انسانوں اور کئی ممالک کا امن غارت کیا پھر داعش کا ہوا دکھا کر انسانیت کو ایک نئی جنگ میں دھکیل دیا۔منٹو نے تقریباً سات دہائیاں قبل ہی اس امریکی سازش کو بے نقاب کر دیا تھا۔چچا سام کے نام پانچویں خط میں لکھتے ہیں:

''سنا ہے آپ نے ہائیڈروجن بم صرف اس لیے بنایا ہے کہ دنیا میں مکمل امن قائم ہو جائے۔یوں تو اللہ کی اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔لیکن مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔ایک اس لیے کہ میں نے آپ کا گندم کھایا ہے اور پھر میں آپ کا بھتیجا ہوں۔بزرگوں کی بات یوں بھی چھوٹوں کو فوراً ماننی چاہئے لیکن میں پوچھتا ہوں اگر آپ نے دنیا میں امن و امان قائم کر دیا تو دنیا کتنی چھوٹی ہو جائے گی۔میرا مطلب ہے کتنے ملک صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوں گے۔میری بھتیجی جو اسکول میں پڑھتی ہے کل مجھ سے دنیا کا نقشہ بنانے کو کہہ رہی تھی۔میں نے اس سے کہا، ابھی نہیں، پہلے مجھے چچا جان سے بات کر لینے دو۔ان سے پوچھ لوں کون سا ملک رہے گا کون سا نہیں رہے گا۔پھر بنا دوں گا۔''(۵)

دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر امریکہ اور اتحادیوں کی مار دھاڑ سے جو مذہبی انتہا پسندی پیدا ہوئی اس نے عراق، شام اور افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی خون میں نہلا دیا۔۲۰۰۸ء کے قریب خودکش دھماکوں نے پاکستان میں زور پکڑا اور یہ سلسلہ ۲۰۱۳ء میں عروج پر پہنچ گیا۔۲۰۱۴ء میں رونما ہونے والا سانحہ اے پی ایس دہشت گردی کی انتہا تھا۔معروف نقاد مہدی جعفر کے الفاظ میں:

''پچھلے دس برسوں کی فضا میں ایک تبدیلی نئے موضوعات کی سطح پر ہوئی جس میں عالمی صدماتی

ماحول داخل ہوا ہے۔ ایران، عراق، افغانستان کے علاوہ دوسری تاریخی جنگوں اور صیہونی طاقتوں
کا لرزہ خیز یا غیر محسوس اثر ہے۔''(۶)

حامد سراج کے متعدد افسانے اسی صورتحال کے عکاس ہیں اور ان سے بہنے والا خون معاشرے کے حساس طبقات کو لہو رلاتا ہے۔ علاوہ ازیں صارف کلچر، ملٹی نیشنل کمپنیاں اور ان کے ہتھکنڈے بھی ان افسانوں کا خصوصی موضوع ہیں۔ معاشرتی بے حسی، بڑھتی تنہائی، انتہا پسندی، کرب، بے روزگاری، مغربی تہذیب کے مضر اثرات، رشتوں میں محبت اور احترام کا فقدان، میاں بیوی میں بڑھتا ہوا عدم اعتماد، انسان کے پاس وقت کی شدید قلت، ، موبائل فون، انٹرنیٹ اور فیس بک کے ذریعے معاشرتی تبدیلیاں، سائنس، خلا اور انسان کے مستقبل کے عزائم، غرض یہ کہ جدید دنیا اور اس کے مسائل کا شاید ہی کوئی موضوع رہ گیا ہو جس پر حامد نے طبع آزمائی نہیں کی۔ حامد سراج کے افسانوی سفر میں کئی پڑاؤ ہیں، تاہم یہاں ان کے افسانوں پر گلوبلائزیشن کے اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔

نائن الیون اور اس کے نتیجے میں امریکہ کی مسلط کردہ ''وار آن ٹیررازم'' نے افغانستان سمیت پورے خطے کو آتش زار بنا ڈالا جس میں سب سے زیادہ متاثر پاکستان ہوا۔ غیروں کی جنگ میں ارض پاک کا امن اور معیشت تباہ ہو کر رہ گئی، مذہب کے نام پر قتل و غارت گری اور انتہا پسندی کو فروغ ملا، لوگ ذہنی مریض بنتے چلے گئے اور اعلیٰ انسانی قدروں نے دم توڑ دیا۔ غیر ملکی ٹیموں کے یہاں آ کر کھیلنے سے انکار کے باعث ہمارے میدانوں میں وہ ابتری پھیلی کہ آج تک ان کی بحالی ممکن نہیں ہو سکی۔ ان افسوسناک حالات کو حامد سراج نے کئی ایک افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا افسانہ 'ایک اور داؤ' ایسی ہی صورتحال کا نوحہ ہے جو ملکی امن کو نگل گئی اور اس کے خوفناک شعلوں میں ہزاروں افراد، ان کے رشتے ناطے، محبتیں اور خواب بھی بھسم ہو گئے:

''میں نے تمہیں بتایا نا...... ہماری زندگی کاغذی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی۔ شہر میں ہوں یا گھر پر...... کیبل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ ہی ہماری تفریح کا واحد ذریعہ ہیں۔ یہ سب مشینی انداز ہیں۔ دوسرا شہر میں ہونے والے خودکش دھماکوں نے ذہن اور زندگی مفلوج کر کے رکھ دی ہے۔ پارک ویران ہو گئے ہیں۔ ہوٹلوں میں جائیں تو مکمل تلاشی، پھر بھی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وہاں کھیل کے میدان بنجر ہو گئے ہیں۔''(۷)

موجودہ دور میں عدیم الفرصتی نوع انسان کا بہت بڑا مسئلہ بن کر ابھری ہے اور کسی کے پاس دوسروں کیلئے وقت نہیں۔ دوستوں کا مل بیٹھنا، گپ شپ لڑانا، لطیفے سنانا اور دل کی باتیں شیئر کرنا قصہ پارینہ بن چکا ہے اور کسی کو دوسرے کا حال دل سننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ جس طرف اور جسے بھی دیکھئے وہ ایسی نفسا نفسی کا شکار ہے یوں سمجھئے کہ سب اپنی اپنی منزل کی جانب بھاگ رہے ہیں گویا صدا بلند ہوتے ہی وہ پتھر کے ہو جائیں گے۔ معروف افسانہ نگار اور نقاد احمد صغیر کے الفاظ میں:

''آج کی تیز رفتار زندگی میں جو سماجی تبدیلی آ رہی ہے اور رشتے کا جو نیا منظر نامہ سامنے آیا ہے، اس پر صرف آج کے افسانہ نگاروں کی نظر ہے۔''(۸)

'مولوی قاسم بہت مصروف ہے' عالمگیریت کی پیدا کردہ اسی صورتحال کا عکاس ہے۔ یہ مختصر مگر پر اثر افسانہ انسان کی بدقسمتی

پر نوحہ کناں ہے۔ دو سادہ منش دوست جو وقت نکال کر اکثر اپنے دکھ سکھ بانٹ لیتے تھے، بدلتے حالات کی بھینٹ چڑھ کر ایک دوسرے سے اس قدر دور ہوئے کہ اخلاقی اقدار کا بھی جنازہ نکل گیا۔ وقت، پہیہ اور انسان کی تثلیث افسانے میں گہری معنویت کی حامل ہے، نظامِ قدرت کے تحت ہر چیز اپنے مدار میں گھوم رہی ہے لیکن انسان بے سمت گھوم رہا ہے۔ مزید حیرت انگیز بلکہ تشویشناک بات یہ ہے کہ وہ چھوٹی سی زندگی کو مینج کرنے کے بجائے بہت بڑی دنیا کو تسخیر کرنے میں لگا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں:

> ''وقت کے گھومتے پہیے نے انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور ہر انسان بے سمت گھوم رہا ہے۔ وہ رات میں جب اپنے بستر پر آ کے گرتا ہے تو اسے یاد آتا ہے یہ تو وہی بستر ہے جسے صبح دم اس نے چھوڑا تھا۔ انسان بہت مصروف ہے۔ وہ سوچتا ہے اور بھاگتا ہے۔ فاصلہ ہی کتنا ہے، قبر تک ہی تو جانا ہے وہ پھر بھی برق رفتار ہے اسے اپنی ذات کے لیے بھی ایک لمحہ میسر نہیں۔ وہ اپنے ساتھ ایک مکمل دن گزارنے کی خواہش تو رکھتا ہے لیکن دن تو کیا اسے ایک ساعت بھی نصیب نہیں۔''(۹)

مولوی قاسم جو ایک نفیس انسان تھا وقت کی روانی میں اس قدر بدل گیا اور زندگی کے جھمیلوں میں اس طرح الجھا کہ دوسرے گاؤں سے آئے اپنے جگری یار کو ملاقات کی چند گھڑیاں بھی خیرات نہ کر سکا اور مصروفیت کا بہانہ کر کے موٹر سائیکل پر نکل گیا۔ مصنف نے موٹر سائیکل کے پہیئے کو وقت کے بہاؤ سے تشبیہ دے کر معنی خیز بنا دیا ہے۔ آخر میں تنہائی کا کرب مصنف کو آنسوؤں میں ڈبو گیا۔ یہ بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ اس وسیع دنیا میں سب کے ہوتے ہوئے بھی آپ تنہا ہیں کیونکہ آپ کو اپنے دکھوں کی صلیب آخر کار خود ہی اٹھانا ہوتی ہے:

> ''ایک روز میں نے اپنی مصروفیات کو تالا لگایا، ذمہ داریوں کو زنجیر ڈال کے ایک طرف پھینکا اور مولوی قاسم کی تلاش میں نکلا۔ مسافت قطع کر کے جب میں مولوی قاسم کے گاؤں پہنچا، دوپہر ڈھل رہی تھی۔ مولوی قاسم اسی خلوص اور تپاک سے ملا۔
> ......چائے آ گئی لیکن چینی والی
> میرے من میں بہت سی باتیں تھیں۔
> ہم ایک زمین کے وسیع کھیت میں چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ میں تھا، مولوی قاسم اور اس کا بیٹا......
> چارپائیوں کے ساتھ موٹر سائیکل کھڑا تھا۔
> مولوی قاسم کو قریبی شہر میں ایک ضروری کام سے جانا تھا۔
> اس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کیا۔
> پہیہ گھوما......موٹر سائیکل کا، یا وقت کا......؟
> پہیہ گھومتے گھومتے رکا تو مجھے سکتہ ہو گیا
> میں ٹیوب ویل کے کنارے اپنے آنسوؤں سمیت تنہا کھڑا تھا۔''(۱۰)

میاں بیوی کے رشتے کو اعتبار باہمی اعتماد سے ملتا ہے جبکہ اس نخل سعید کو خونِ جگر اور خلوص و محبت سے پروان

چڑھانا ہوتا ہے۔قبل ازیں ہمارا یہی طرہ امتیاز اور معاشرتی وقار تھا۔مگر جدید ذرائع مواصلات یعنی انٹرنیٹ،موبائل،فیس بک وغیرہ کی یلغار نے اس اعتماد کا بھی خون کرڈالا۔آزادخیالی،ہٹ دھرمی،خودغرضی اور لاتعلقی کو اس قدر پروان چڑھایا گیا کہ خاندان کا ادارہ ہی بکھرنے لگا۔مادی آسائشات کی طلب میں پھنسے لوگ ہوس پرستی کے جنگل میں بھٹکنے لگے اور رشتوں کا تقدس اور حلال وحرام کا فلسفہ خواب وخیال ہوکر رہ گیا۔خاص طور پر ہمارا ماڈرن طبقہ مغربی سیلاب میں تنکوں کی طرح بہنے لگا۔

حامد کا افسانہ'سیاہ کار'ہمیں ایک ایسی ہی دنیا کی جھلک دکھاتا ہے جس میں دو الگ الگ گھرانے وقت کی رو میں یوں بہتے چلے جا رہے ہیں کہ'نے ہاتھ برگ پہ ہے نا پا ہے رکاب میں' کی زندہ تصویر دکھائی دیتے ہیں۔سب اپنی اپنی دنیا میں گم ہیں مگر کسی کو اطمینان قلب میسر نہیں۔متوسط طبقے کے نو بیاہتا میاں بیوی حصول دولت کیلئے ملازمت کرتے ہیں اور اچھی زندگی اور ہائی سٹیس پانے کا خواب انھیں کسپل چین نہیں لینے دیتا،ان کی یہی بھاگم بھاگ انھیں ایک دوسرے سے بہت دور لے جاتی ہے اور وہ کسی اور کی بانہوں میں جا کر دولت اور جنس حاصل کرنے میں مصروف ہوجاتے ہیں جبکہ دوسری طرف دولت مند میاں بیوی بھی عدم اطمینان کا شکار ہیں اور محبت وجنس کو بازار سے خرید کر تسکین دل کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔گویا مصنف نے دونوں طبقات کو ایک مرکز پر لا کھڑا کیا ہے اور وہ ہے عدم اطمینان۔

متوسط طبقے کی بے لگام ہوتی خواہشات اسے جس قعر مذلت میں گرا رہی ہیں افسانے میں اس کا نفسیاتی اور بتدریج ارتقا دکھایا گیا ہے۔چھوٹے چھوٹے مگر موثر مکالمے نفاست اور مہارت سے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں جو فنی پختگی کے بغیر ممکن نہیں۔افسانے کا آغاز اس ہائی سوسائٹی اور اس کے زیر تصرف انتہائی مہنگی ہاؤسنگ سکیم سے ہوتا ہے جہاں ایک تنخواہ دار اور خوبصورت نو بیاہتا جوڑا مستقبل کے سہانے سپنوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔میاں بیوی کی گفتگو میں راتوں رات امیر ہونے کی تڑپ بتدریج ان کے اخلاقی زوال مگر دنیاوی ترقی کی نشاندہی کرنے کو کافی ہے۔میاں بیوی لانگ ڈرائیو پر نکلے ہیں جہاں خاتون کے موبائل پر وائبریشن اور اس کا پریشان کن ردعمل شوہر کے دل میں وسواس کا سبب بن جاتا ہے جبکہ فلیش بیک کے ذریعے ہمیں خاتون کی نئی اڑان کا پتہ چلتا ہے جو ایک نامعلوم میسج سے شروع ہوئی اور جسم فروشی کی ذلت تک آ پہنچی:

> ''ذکیہ کا موبائل اب مستقل سائلنٹ موڈ پر رہنے لگا۔ذاکر کے پاس بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ
> اس پر توجہ دیتا۔وہ دن بدن کسی اور دنیا کو نکلتی جا رہی تھی۔بات مذاق سے شروع ہوئی،چند ایس
> ایم ایس اور کبھی کبھی ایک کال،لیکن اب وہ اس کیلئے بے تاب رہنے لگی۔''(۱۱)

میسجز سے بڑھتی ہوئی بات نئی نویلی دلہن کو اس خریدار کے حجلہ عروسی میں لے گئی جو دولت سے اپنی پسند کا ہر جسم مسہری پر سجانے کی طاقت رکھتا تھا،یہاں دو طرح کی ہوس ہم آغوش دکھائی دیتی ہے،دولت اور جنس کی ہوس۔اگر آدمی کے پاس حسن اور جوانی ہو تو دولت اس کے ہمرکاب چلتی ہے اور اگر اس کے پاس دولت کا جادو ہو تو پھر شباب وشراب کا حصول مشکل نہیں رہتا۔

احمد فراز کے الفاظ میں:

غم دنیا بھی غم یار میں شامل کر لو
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں(۱۲)

بیوی اگرچہ خود بے وفائی کی مرتکب ہے اور ایک نودولتیے سے اپنے حسن وجوانی کی قیمت وصول کر رہی ہے۔لیکن دوسری

طرف وہ اپنے شوہر پر نظر رکھتی ہے اور اس کے موبائل پر کچھ مشکوک میسجز دیکھ کر جواب طلبی سے بھی دریغ نہیں کرتی:

''مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ آپ کو یا اتنے ولگر ایس یم ایس کون کرتا ہے؟''(۱۳)

دوسری طرف اس خاتون کا شوہر بھی ایک حسین عورت کی زلفوں کا اسیر ہو کر دادِ عیش دینے لگتا ہے، وہ بھی اخلاقی اقدار کی پامالی اپنا حق گردانتا ہے اور جسم فروشی کی دولت سے میسر آسائشات کو اپنے لیے معیوب نہیں سمجھتا۔ ایک تعلیم یافتہ نوجوان اور ایک امیر خاتون مذہب و اخلاق کو نظر انداز کر کے ایک دوسرے کی دنیا میں گم ہیں مگر انہیں کوئی ملال نہیں۔ معروف نقاد وارث علوی نے لالی چوہدری کے افسانوں کا فنی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''دورِ جدید کی عورت جو تعلیم یافتہ ہے، خود کو مرد کے برابر سمجھتی ہے اور اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہو سکتی ہے، وہ مرد کی بے وفائی کو برداشت نہیں کر سکتی، اس سے طلاق لے لیتی ہے، آزاد ہو جاتی ہے، ملازمت کرتی اور اپنے بچوں کی آپ پرورش کرتی ہے۔''(۱۴)

علوی صاحب کی بات بجا مگر نئی صدی میں دنیا اس سے کہیں آگے نکل گئی ہے۔ افسانے میں موجود امیر عورت جسم خریدنے میں اپنے میاں سے پیچھے نہیں۔ یہاں دورِ جدید کی عورت ابھر کر سامنے آتی ہے جو میاں کی بے وفائی پر ٹسوے بہانے اور صفِ ماتم بچھانے کی قائل نہیں۔ بلکہ وہ بھی شوہر کی بے وفائی کو جواز بنا کر گھر کو عشرت کدہ بنا لیتی ہے:

''اس کا عذاب کیا تھا......؟ اس کے ہسبینڈ کے پاس وقت نہیں تھا اور وقت خریدنا چاہتی تھی ایک ایسے شخص سے جو اس پر توجہ دے، اس کو سراہے۔ اس کی تعریف کرے، اس کے نام کا سانس لے۔ وہ سب کچھ اپنی بے پناہ دولت سے خریدنا چاہتی تھی اور سڑک کنارے ملنے والے ذاکر نے اس کی تمام تشنہ ضرورتیں پوری کر دیں۔''(۱۵)

ڈاکٹر انور سدید کا ایک مضمون ہے 'کیا چھوٹے شہر میں بڑا ادب پیدا نہیں ہو سکتا؟'۔ انجم اعظمی کے جواب میں لکھتے ہیں: ''ادبِ عالیہ کے لیے بڑا تجربہ بلاشبہ اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ ثابت کرنا شاید ممکن نہیں کہ بڑا تجربہ صرف بڑے شہروں سے حاصل ہوتا ہے۔ تجربے کی ضیائیں بوقلموں اور زاویئے بے کراں ہیں۔ بعض اوقات چھوٹے شہر کا ایک چھوٹا سا واقعہ ادیب کی فکری زندگی میں کہرام برپا کر دیتا ہے اور جب تجربے میں ڈھلتا ہے تو تجربے کی لو دینے لگتا ہے''۔(۱۶)

اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو حامد سراج کے کئی ایک افسانے ڈاکٹر انور سدید کے تجزیئے کی تائید کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ 'گاؤں کا غیر ضروری آدمی' اس کربناک صورتحال کا نوحہ ہے جس میں موجودہ دور کا انسان گرفتار ہے۔ وہ زندگی کی اخلاقی ہی نہیں مذہبی اقدار بھی بھول چکا ہے، اسے کسی کی زندگی یا موت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ افسانہ ایک ایسے ہنرمند کی موت سے متعلق ہے جس نے گاؤں اور اس کے مکینوں کو زندگی کی روانی دی لیکن جب وہ انتقال کر گیا تو اس کا جنازہ کندھوں کا منتظر رہ گیا۔ حامد نے یہاں معاشرے کے اس تاریک پہلو کو یوں اجاگر کیا ہے کہ انسانیت کی سسکیاں دبائے نہیں دبتی جبکہ ہماری معاشرتی بے حسی سر بازاریوں برہنہ دکھائی دیتی ہے کہ اس کے جسم پر کوئی چیتھڑا تک باقی نہیں۔ سب سے کارآمد آدمی کو گاؤں کا 'سب سے غیر ضروری آدمی' قرار دے کر مصنف نے طنز کی انتہا کر دی جبکہ ایک عام سی کہانی میں انسانی بے حسی کو سمو کر بہت خاص بنا دیا ہے:

''جی وہ خیرو مر گیا ہے۔اس کے مرنے کا اسپیکر پر اعلان کر دیں۔اس کے چہرے پر دکھ کا کوئی پرتو نہیں تھا۔''(۱۷)

لوگوں نے ایک ہنر مند کی موت کو اس طرح نظر انداز کر دیا جس طرح اس کا گاؤں میں کبھی وجود تھا ہی نہیں۔کوئی اس کی یتیم بچیوں اور مخبوط الحواس بیٹے کے سر پر دست شفقت رکھنے نہیں آیا۔

حامد سراج نت نئی سائنسی اصطلاحات سے واقف ہی نہیں ان کا ادب کے میدان میں استعمال بھی خوب جانتے ہیں۔ان کا افسانہ 'کلوننگ کی پیداوار' اسم با مسمٰی ہے۔ہم شکل وصورت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی اپنے برے اعمال میں دوسروں جیسے ہی ہیں۔اس افسانے میں ایک ایسے بے روزگار نوجوان کا تذکرہ ہے جو بیروزگاری اور غربت کا عذاب جھیل رہا ہے، وہ کبھی ایک تو کبھی دوسرے دفتر میں عرضیاں گزار گزار کر تنگ آ جاتا ہے۔ایک بار جب وہ بڑے عہدے کا اشتہار دیکھ کر اپلائی کرتا ہے تو بہترین تعلیمی کیریئر اور شاندار انٹرویو کے باوجود وہ سفارش کلچر کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔اس افسانے میں مصنف نے بیروزگاروں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے، کیونکہ غربت اور بیروزگاری جو نئے زمانے کے سنگین مسائل ہیں ہماری نسل نو کو مایوسی، غربت، پریشانی اور منشیات کی دلدل میں دھکیلتے چلے جا رہے ہیں۔ہمارا معاشرتی رویہ چڑ چڑے پن کر شکار جبکہ نفسیاتی مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں:

''کبھی کبھار اس کے باپ کی دکاندار سے چخ چخ ہو جاتی تو اس کا خون کھولنے لگتا۔اسے لگتا تھا اس گھر سے عزتِ نفس کا جنازہ نکل گیا ہے۔بیروزگاری نے سب کے مزاج چڑ چڑے کر دیے تھے۔''(۱۸)

افسانے کے آخر میں اس کی والدہ اخبار میں دوبارہ اسی اسامی کا اشتہار دیکھ کر اس سے پوچھتی ہے کہ کیا یہ وہی اشتہار نہیں جس کے لیے تم نے انٹرویو دیا تھا جس پر وہ اثبات میں سر ہلا کر کہتا ہے:

''امی رہنے دیجیے......اس ملک کی ساری بیوروکریسی اور اربابِ اقتدار کے چہرے ایک سے ہیں۔یہ سب کلوننگ کی پیداوار ہیں۔''(۱۹)

سائنسی حوالے سے ان کا ایک اور افسانہ 'زمین زاد' بھی نہایت اہم ہے، جس میں انہوں نے زمین سے باہر دوسری دنیاؤں کو دریافت کرنے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی کوششوں کا عالمانہ جائزہ لیا ہے۔خاص طور پر انہوں نے نہایت مہارت کے ساتھ سائنس کی دریافتوں کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنے کی کامیاب کاوش کی ہے۔انہوں نے قرآنی آیات کے حوالے سے واقعہ معراج کی سائنسی توجیح کی ہے جبکہ روشنی کے سفر، مادے کی ہیئت کذائی اور تصور زماں کو بھی قرآنی حوالوں سے سامنے لائے ہیں۔اس افسانے میں شروع سے آخر تک عالمگیریت کی لہریں کبھی جوار بھاٹا پیدا کرتی ہیں اور کبھی زیر آب رہتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتی ہیں۔زمین پر اقتدار کی لڑائی میں بازی مار کر امریکی چاند پر جا پہنچے اور وہاں سے مریخ پر کمندیں ڈالنے کا منصوبہ شروع کر دیا۔روسی، چینی، بھارتی اور دیگر عناصر بھی خلاؤں پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول کے لیے کوشاں ہیں۔اس کشمکش نے جہاں زمین پر بدامنی اور سازشوں کو فروغ دیا وہیں خلا میں برتری حاصل کرنے کی جنگ بھی تیز ہوگئی۔زمین پر موسم کی بے یقینی، بڑھتی آلودگی اور پھیلتی بیماریاں بہت کچھ اسی دوڑ کا شاخسانہ ہیں:

''سائنس دان انسان کو مریخ پر اتارنے کا حتمی فیصلہ کر چکے تھے۔کانفرنس میں پورے کرہ ارض

کے سائنس دانوں اور مذہبی سکالرز کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔"(۲۰)

علاوہ ازیں یہ امر بھی دور جدید کے حوالے سے نمایاں ہو کر مزید سامنے آتا ہے کہ انسان چاہے خلاؤں کو تسخیر کر چکا ہو لیکن وہ دلوں کو تسخیر نہیں کر سکا اور باہمی محبت نہ ہونے کے باعث اربوں انسانوں کی اس دنیا میں تنہا ہے۔ ذرا اس کرب کا اظہار دیکھئے:

"وہ کس سے گلے ملتے۔کون ان سے مل کے خوش ہوتا......کون ان کی تنہائی کا دکھ بانٹتا۔اَن گنت چہروں کے درمیان ان کا کوئی بھی اپنا نہیں تھا!وہ اربوں انسانوں کے درمیان پھر تنہا ہو گئے!"(۲۱)

نئی دنیا کے المیوں میں سے ایک دولت کی طلب اور سہولیات کی کشش میں مادر وطن سے جدائی ہے۔ترقی پذیر ممالک کے کروڑوں شہری اچھے مستقبل کی امید پر دیار غیر چلے جاتے ہیں،اجنبی دیسوں کو مستقل ٹھکانہ بنا لیتے ہیں لیکن دل سے وطن کی محبت نہیں نکال سکتے۔'اور یگان' ایک ایسے میاں بیوی کی کہانی ہے جن کے خیالات میں بعدالمشر قین ہے۔غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کویت جانے والا علی احمد کبھی واپس پلٹنا نہیں چاہتا جب کہ اس کی بیوی ایک لمحہ بھی دیار غیر میں رکنے کو تیار نہیں۔نفرت و محبت کی یہی کشمکش اس افسانے کی جان ہے۔علی احمد کہتا ہے:

"میں جس دن اپنی دھرتی چھوڑ کر کویت پہنچا،میرے من میں صرف خواب تھے۔میری سوچ تھی کہ پیسہ کما کر خواب خریدے جا سکتے ہیں۔میرے اندر خوابوں کا میلہ لگا تھا۔"(۲۲)

لیکن وقت نے یہ تلخ حقیقت اس پر بے نقاب کر دی کہ پیسے سے سہولیات تو خریدی جا سکتی ہیں لیکن محبت اور اطمینان قلب نہیں۔وہ دولت کے بل بوتے پر شہرت،ناموری اور طاقت حاصل کرنے نکلا تھا لیکن اسی کوشش میں وہ اپنے قبیلے سے بچھڑ گیا۔اس کی بیوی کا جواب اس کو آئینہ دکھاتا ہے:

"یہ سرزمین تمہاری نہیں۔تم فضا میں معلق ہو۔علی احمد،میں نے گھر کا خواب ضرور دیکھا تھا،لیکن ایسے گھر کا نہیں جس میں روبوٹ رہتے ہوں......تم ایک مشین ہو،صرف مشین۔میں پاکستان جاؤں گی۔"(۲۳)

اردو ادب میں عالمگیریت کو عروج نائن الیون کے بعد ملا لیکن صاحبان نظر اس کی چاپ کو پہلے سے محسوس کر رہے تھے۔نوے کی دہائی میں روس کی افغانستان میں پسپائی اور شکست نے امریکہ کو دنیا کی واحد سپر پاور بنا دیا تھا۔گویا دنیا دو قطبی کے بجائے یک قطبی ہو گئی لہٰذا نئے تھانیدار نے دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کیلئے ایک نئی پالیسی مرتب و نافذ کرنے کی کوشش کی جسے نیو ورلڈ آرڈر کا نام دیا گیا۔اسی دور میں امریکن کمپنیوں کو دنیا بھر میں پر پھیلانے کا موقع ملا،میڈیا کے ذریعے پراپیگنڈہ مشینری نے مغربی تہذیب اور کلچر کو ترقی دینے کی سازش کی،فحاشی و عریانی کو سماج کا حصہ بنانے کیلئے پلاننگ اور فنڈنگ ہوئی،مغربی کھانے اور لباس ہمارے کلچر کا حصہ بنا اور ایک ایسا مغرب زدہ طبقہ پیدا کیا گیا جو کھانے میں برگر اور پینے میں پیپسی کو معمول بناتا گیا،شلوار قمیص کی جگہ جینز اور تمیز کی جگہ بولڈنیس نے لے لی۔بہر حال نئی تہذیب کے نئے تقاضوں نے ماحول کو اس طرح اپنے حصار میں لیا کہ مشرقی طور طریقے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔اس بدلتی ہوئی صورتحال کو حامد سراج کے افسانے 'رونمی' میں محسوس کیا جا سکتا ہے:

''صدی کی آخری دہائی میں انسان بے حس اور مکان حساس ہو گئے تھے۔ مکان بھی نئی تہذیب میں ڈھل کر ماڈرن ہو گئے۔ بناؤ سنگھار کرنے لگے۔ زرق برق لباس پہننے لگے۔ لیکن انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے۔''(۲۴)

حامد سراج دنیا کی سیاسی صورتحال پر بھی نظر رکھتے ہیں اور ایٹمی طاقتوں کی زیادہ سے زیادہ وسائل پر قبضے کی ہوس انہیں تشویش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ انہیں علم ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور دیگر ایٹمی طاقتوں نے دنیا کو ڈرا دھمکا کر اپنی لونڈی بنا رکھا ہے اور اگر سپر پاورز نے اسلحہ و بارود بنانے اور چلانے کا خونیں کھیل بند نہ کیا تو وہ دن دور نہیں جب پوری انسانیت اپنی بینائی کھو دے گی اور سب تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جائیں گے۔ ان کا افسانہ 'گلوبل ویلیج' دنیا کی ایک ایسی بھانک تصویر پیش کرتا ہے جہاں کوئی آنکھ سلامت نہیں اور وہاں کے باشندوں نے کبھی روشن چاند اور چمکتا آسمان نہیں دیکھا۔ وہ قدرت کی رنگینیوں سے بھی ناآشنا ہیں اور مسکراتی صبحوں، شفق رنگ شاموں سے بھی واقف نہیں۔ یہ صورت حال گویا بین السطور موجودہ دنیا کی منظرکشی ہے جہاں ناانصافی کا دور دورہ ہے اور ظالم کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔ عالمی دہشت گرد اخلاقی اقدار سے اس قدر بے بہرہ ہو چکے ہیں کہ انہیں معصوم بچوں پر بھی بم برساتے ہوئے بھی ذرا تامل نہیں ہوتا:

''ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ جب ہماری بینائی چھن گئی تھی اس وقت کرہ ارض ایٹم بم کی زد میں تھا۔ دنیا کے سات ممالک نے کامیاب ایٹمی دھماکے کر کے اپنا لوہا منوالیا تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد پاکستان اور ہندستان ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑے تھے۔ برّ اعظم ایشیا سلگ رہا تھا۔ بیسویں صدی کو کمپیوٹر کی صدی قرار دے دیا گیا تھا۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں ڈی این اے کو تو دریافت کر لیا گیا تھا لیکن ایڈز اور کینسر جیسے مہلک امراض کا علاج ابھی دریافت نہیں ہوا تھا۔''(۲۵)

دہشت گردی صرف وہ نہیں جو خودکش دھماکے سے پھیلتی یا ۵۲ طیاروں کی کارپٹڈ بمباری سے جنم لیتی ہے بلکہ وہ عمل بھی دہشت گردی کی ذیل میں آنا چاہیے جو کٹی پھٹی لاشوں، سسکتے، کراہتے زخمیوں اور آہ و بکا کرتے لواحقین کی تصویریں شائع کر کے مایوسی پھیلا رہا ہے۔ چٹ پٹی اور مصالحہ دار خبروں سے لوگوں کو نت نئے زخم دینا، ان کی خواہشات کو کچلنا اور انہیں ڈپریشن کا شکار بناتے ہوئے زندگی سے کنارا کشی پر مجبور کر دینا بھی دہشت گردی سے کم نہیں۔ عالمگیریت کے ذریعے زیادہ سے زیادہ فوائد سمیٹنے کے خواہشمندوں کے لیے ایک ڈری سہمی، پریشان حال اور مایوس قوم آسان ہدف ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا کے ذریعے پھیلے خوف کے باعث اس قدر ہتھیار اور سکیورٹی کیمرے ہم نے پوری تاریخ میں نہیں خریدے جتنے ایک ڈیڑھ دہائی میں خرید چکے ہیں۔ ہمارے ہاں جس قدر بلٹ پروف گاڑیاں، جدید ترین اسلحہ، خاردار تاریں، بلند و بالا حفاظتی دیواریں، واک تھرو گیٹس اور میٹیل ڈیٹکٹرز آئے ہیں وہ سب درآمد کیے گئے ہیں جن پر ہمارا قیمتی زرمبادلہ بھی بے تحاشا صرف ہوا جبکہ ہماری قوم کی کمر ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ افسانہ 'ہے کوئی' کا ایک اقتباس دیکھئے:

''دانش ور اخبار سامنے پھیلائے قہقہے لگا رہے تھے۔ وہی خبریں چبانے کا ایک سا عمل......دہشت گردی، خوف، گینگ ریپ، قتل، اغوا، زنا بالجبر، مہنگائی، بدامنی، اغوا برائے تاوان، مسجد کے صحن میں نمازیوں کی لاشیں، بس اور ٹرین میں دھماکے، نسلی تعصّبات......وہ سوچنے لگا لوگ اخبار کا مطالعہ

کیوں کرتے ہیں......؟ اخبارات ہمیں کیا دے رہے ہیں، بے چینی، خوف و ہراس، مستقبل کے اندیشے، بے چینی کی فضا......کیا......کیا......؟ ایک کیڑا اخبار کی سطور میں رینگنے لگا......پھر اس نے لاتعداد کیڑے رینگتے دیکھے......اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ دانشور اخبار کی بجائے اس کا چہرہ پڑھ لیتے وہ وہاں سے اٹھ آیا۔"(۲۶)

حامد سراج کے اکثر افسانوں میں ہم عالمگیریت کے اثرات ملاحظہ کر سکتے ہیں، جہاں نت نئی کہانیوں کے ذریعے ہمیں عالمی طاقتوں کی وحشت سے روشناس کرایا گیا ہے۔ انسان کی حاکمانہ فطرت نے اپنا اقتدار اور اختیار دائمی بنانے کی دھن میں دنیا کو ایک عبرت کدے میں تبدیل کر دیا ہے جہاں روبوٹ تو رہ سکتے ہیں مگر زندہ ضمیر کے ساتھ پیدا ہونے والے انسانوں کیلئے کوئی جگہ نہیں:

"یہ نئی صدی ہے نئے تقاضے ہیں۔ اب افسانہ بھی داستان کی طرح متروک ہونے والا ہے اور صرف دو سطری افسانچہ ہی تراشا جائے گا کیونکہ آج کے انسان کی برق رفتار مصروفیات اسے اتنا وقت ہی نہیں دیتیں کہ وہ مطالعہ کرے۔ بستر پر گر کر اسے صرف اتنا یاد رہتا ہے کہ مجھے سلیپنگ پلز لینی ہیں اور صبح ہونے پر پھر انسانوں کے جنگل میں گم ہو جانا ہے۔ رزق تلاشنا ہے عجیب عہد ہے یہ! یہاں توقیر کا معیار دولت ہے، یہاں کامیاب اِنسان اُسے گردانا جاتا ہے، جس کے پاس مرسڈیز ہو، لینڈ کروزر، کوٹھی، بینک بیلنس، شاندار بین الاقوامی بزنس، آئے دِن نئے ماڈل کی کار اور عورت خریدنا اس کا مشغلہ ہو اور تم قدیم عہد کے اِنسان اپنی نامعلوم محبت کا قصہ لے بیٹھے ہو۔ متروک عہد کی تو اب باقیات بھی کہیں نظر نہیں آتیں۔"(۲۷)

شہروں میں نفسا نفسی کا عالم تو پہلے ہی طاری تھا اب ہر طرف اگتی فلک بوس عمارتوں نے انسان کو مزید بے دست و پا کر کے رکھ دیا ہے۔ نت نئی سہولیات کے حصول کی تگ و تاز میں انسانی زندگی درد کی تصویر بنتی چلی جا رہی ہے اور فرد اپنے اندر جنم لیتی گھٹن کو پیاروں سے بانٹ کر اپنا غم غلط کرنے کا بھی حوصلہ نہیں رکھتا۔ اس کربناک صورتحال کا ایک عکس ہمیں محمد حامد سراج کے افسانے "گرمی بہت ہے" کے مرکزی کردار میں ملتا ہے جو تمام تر سہولیات کی موجودگی میں بھی سکھ کا سانس نہیں لے پا رہا:

"بالکنی میں کھڑے ہو کر اس نے آسمان پر آدھے چاند اور سامنے رات کی تاریکی میں آسیب زدہ فلیٹس کی کئی منزلہ عمارتوں پر ایک نظر ڈالی۔ فلیٹس......اور فلیٹس میں بستے خاندان، کسی کسی کمرے سے جھانکتی روشنی، قریباً ہر فلیٹ میں ایئر کنڈیشن چل رہا تھا اور اس مشینی شور نے حشرات الارض کا شور نگل لیا تھا۔ اس کے اپنے اندر بھی اک شور بپا تھا۔"(۲۸)

حامد نے دور جدید اور اس کے مسائل کا خلاصہ محض پانچ الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

"درد......کرب......بے بسی......گھٹن......آنسو......!"(۲۹)

ان چند اقتباسات کو مشتے از خروارے قرار دیا جا سکتا۔ امید رکھنی چاہئے کہ حامد سراج کا قلم اردو ادب کی تابانیوں میں اضافے کا باعث بنتا رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ وارث علوی،ادب کا غیر اھم آدمی،(دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۱ء)،ص۱۳۹
۲۔ محمد حامد سراج،بخیہ گری،(راولپنڈی: الفتح پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء)،ص۱۰
۳۔ ایضاً،ص۲۰
۴۔ وارث علوی،اوراقِ پارینہ،(دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۸ء)،ص۱۳
۵۔ سعادت حسن منٹو،اوپر۔نیچے اور درمیان،(دہلی: ساقی بک ڈپو،۱۹۸۹ء)،ص۲۲۳
۶۔ مہدی جعفر،نئے افسانے کی اور منزلیں،(نئی دہلی: اصیلہ آفسٹ پرنٹرز،۲۰۰۷ء)،ص۸
۷۔ محمد حامد سراج،بخیہ گری،ص۳۷
۸۔ احمد صغیر،اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۹ء)،ص۱۲
۹۔ محمد حامد سراج،بخیہ گری،ص۱۱۵
۱۰۔ ایضاً،ص۱۱۶ ۱۱۔ ایضاً،ص۱۳۵
۱۲۔ احمد فراز،درد آشوب،(دہلی: کتابی دنیا،۲۰۰۲ء)،ص۶۲
۱۳۔ محمد حامد سراج،بخیہ گری،ص۱۳۸
۱۴۔ وارث علوی،گنجفہ باز خیال،(دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۷ء)،ص۶۰
۱۵۔ محمد حامد سراج،بخیہ گری،ص۱۴۲
۱۶۔ انور سدید، اردو افسانے کی کروٹیں،(لاہور: مکتبہ عالیہ،۱۹۹۱ء)،ص۷۵
۱۷۔ محمد حامد سراج،برائے فروخت،(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۹ء)،ص۷
۱۸۔ ایضاً،ص۲۱ ۱۹۔ ایضاً،ص۲۵
۲۰۔ محمد حامد سراج،وقت کی فصیل،(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۹ء)،ص۴۸
۲۱۔ ایضاً،ص۵۹ ۲۲۔ ایضاً،ص۱۴
۲۳۔ ایضاً،ص۶۴ ۲۴۔ ایضاً،ص۴۲
۲۵۔ ایضاً،ص۸ ۲۶۔ ایضاً،ص۲۵
۲۷۔ محمد حامد سراج،چوب دار،(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۹ء)،ص۸۴
۲۸۔ ایضاً،ص۱۲۵ ۲۹۔ ایضاً،ص۱۲۵